مسز اینی بیسنٹ

مسز اینی بیسنٹ ۱۸۹۳ء میں ہندوستان آئیں اور اس کے بعد سے انہوں نے ٹھیٹھ ہندوانہ طریقیسے اپنی زندگی بسر کرنی شروع کردی اور بنارس کے مقدس شہر کو جس کے متعلق شیخ علی حزیںؔ لکھتا ہے:

از بنارس نہ روم لطفِ قیام است ایں جا
ہر برہمن بچۂ لچھمن و رام است ایں جا

اپنا مستقر بنالیا۔ مرحومہ کے انتقال کے بعد تھیوسوفیکل سوسائٹی کے صدر جارج ایس ایرنڈیل نے لکھا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ شانتی کُنج بنارس میں مرحومہ کی زندگی ہر لحاظ سے ہندو یوگی کی طرح گزری۔ وہ ہندوستانی لباس زیب تن کرتی تھیں اور ہندوانہ طرز کا کھانا کھاتی تھیں۔ وہ عبادت بھی ہندوانہ طریقہ پر کرتی تھیں۔''

وہ ساری عمر سچائی کی پرستار رہیں۔ عیسائی گھرانے میں پیدا ہونے اور ایک پادری کی بیوی بننے کے باوجود انہوں نے بعض کلیسائی رسوم کو ماننے سے صاف انکار کردیا جس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلا۔ انہوں نے ریاکاری کے حضور میں خراجِ تحسین ادا کرنا کبھی پسند نہیں کیا، بلکہ مذہب کے معاملہ میں اپنی والدہ محترمہ کی منت سماجت کی بھی پروا نہ کی۔ وہ ضمیر کی آواز کو ہر چیز پر مقدم رکھتی تھیں۔

ہندوستان آنے کے بعد انہوں نے ہندو دھرم کا مطالعہ کیا وہ بھی اس شان سے کہ تھوڑی سی مدّت میں انہوں نے سنسکرت جیسی ادق زبان میں مہارتِ تامہ حاصل کرلی، اور ۱۹۰۷ء میں بھگوت گیتا کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ اپنی سلاست اور دل آویزی کے اعتبار سے انگریزی علم و ادب میں اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔

انہوں نے ۱۸۹۸ء میں سینٹرل ہندو کالج قائم کیا اور ۱۹۱۳ء میں اسے پنڈت مدن موہن

مالویہ کے حوالے کر دیا تا کہ وہ بنارس ہندو یونیورسٹی کا گہوارہ بنے۔انہوں نے سارے ہندوستان میں قومی اُصولوں پر تعلیم دینے کی غرض سے تھیوسوفیکل ہائی اسکول قائم کیے۔ان مدارس میں نہ تو طلبا کو جسمانی سزادی جاتی تھی اور نہ خوف و ہراس کے ذریعہ ان کی ذہنی بالیدگی کو ٹھٹھرنے دیا جاتا تھا۔ان مدارس میں شادی شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کو داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں میں صغرسنی کی شادی کی قبیح رسم کو محدود کرنے کا یہ بہت اچھا طریقہ تھا۔ان مدارس کے اساتذہ طلبا کے والدین سے بھی میل جول رکھتے تھے تا کہ بچوں کی تربیت کے دشوار کام میں گھریلو اثرات سے بھی کام لیا جائے۔ان میں ایک اسکول کانپور میں تھا اور مجھے وہاں تین سال تک ٹیچر کی حیثیت سے کام کرنے کی عزت حاصل رہ چکی ہے۔وہیں مسز بیسنٹ کی خدمت میں مجھے پہلی مرتبہ نیاز حاصل ہوا۔

انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے اسلام پر دو لیکچر بھی دیے تھے۔ان دونوں لیکچروں میں انہوں نے مسلمانوں کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔وہ مسلمانوں کی موجودہ حالت سے مطمئن نہ تھیں بلکہ وہ انہیں اُسی بلندی پر دیکھنا چاہتی تھیں جس کے وہ اپنے مذہب کی اعلیٰ تعلیمات کے اعتبار سے حقدار ہیں۔ان لیکچروں میں وہ مسلمانوں کو ان کے ماضی کا واسطہ دے کر ان سے درخواست کرتی ہیں کہ ''وہ مسلمان بنیں، جہالت کے داغ کو اپنی پیشانی سے دھوئیں اور اپنے بزرگوں کے علمی کارناموں کو اجاگر کریں۔''

ایک لیکچر میں وہ مسلمانوں کی غیر معمولی شجاعت کا ذکر یوں فرماتی ہیں:

> ''اپنے پیغمبر پر اعتقاد رکھنے نے ان کے دلوں سے موت کے خوف و ہراس کو دور کر دیا ہے۔افریقہ کے درویشوں سے بڑھ کر آپ کو بہادری کہاں مل سکتی ہے؟ انہوں نے اس مقام پر حملہ کیا جہاں کیٹلنگ توپیں گولہ باری کر رہی تھیں اور پھر وہ ایک دوسرے پر مرتے چلے گئے اس سے پہلے کہ وہ دشمن تک پہنچ سکیں۔وہ موت کے منہ میں اس طرح سے جا رہے گویا کہ کوئی شخص دلہن کے کمرے میں جاتا ہو۔وہ یہ کام محض پیغمبرِ عرب کی محبت اور اسلام پر ایمان رکھنے کی وجہ سے کر رہے تھے۔ایسے بہادر مذہب کے لیے بالضرور دُنیا میں زبردست مستقبل موجود ہے۔ایسا مذہب اس سے بہت زیادہ بلند جگہ پر قائم

ہونا چاہیے جتنی بلندی پر وہ آج پایا جاتا ہے۔''

دوسرے لیکچر میں انہوں نے اسلامی تعلیمات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے اور ان اعتراضات کو دور کیا ہے جو غیر مسلم بالخصوص پادری صاحبان اسلام پر کیا کرتے ہیں اور آخر میں ہندو مسلم اتحاد کی اپیل کی ہے۔ اس سادہ اور مؤثر اپیل کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس طرح ایک گھنٹے تک تقریر کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب تر لے آؤں۔ کیا ہم یہ محسوس نہیں کر سکتے کہ ہم ایک دوسرے کے بھائی ہیں؟ ہر مذہب سچائی کے سورج کی ایک کرن ہے۔ ہم اسی گھر کی طرف لوٹ رہے ہیں جہاں سے ہم آئے تھے..... قرآنِ مجید میں ہے: سب کے سب خدا کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں سوائے اس کے چہرے کے۔ اسے خواہ اللہ کہہ کر پکاریے، خواہ جیہووا کہئے، خواہ آھر مزدا کے نام سے یاد کیجئے، خواہ ایشور کہیے، نام تو بہت ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل مختلف، مگر وہ ایک ہی ہے۔ ہم سورج کو مختلف مقامات سے دیکھتے ہیں لیکن وہ آسمان میں ایک نہ بدلنے والی روشنی کی طرح جلوہ فگن ہے اور ہم سب پر اس کی کرنیں یکساں طریقہ سے پڑ رہی ہیں۔ ہم سب ایک ہی باپ کے بچے ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ گھر جاتے وقت ایک دوسرے سے جھگڑا کریں؟''

اگرچہ مسز بیسنٹ کانگریس میں شامل تھیں لیکن انہوں نے اپنے طور پر ہوم رول کی تحریک بھی چلائی اور اس کے ذریعہ ملک بھر میں سیاسی بیداری پھیلائی۔ ہارنیمین، جناح اور بعض دوسرے مسلم اکابر اِس تحریک میں ان کے رُفقائے کار تھے۔ جون ۱۹۱۷ء میں مدراس کے گورنر لارڈ پینٹ لینڈ کے حکم سے وہ نظر بند کی گئیں۔ ستمبر میں جب وہ رہا ہوئیں تو انہیں کانگریس کی صدارت پیش کی گئی۔ چنانچہ دسمبر میں جو ایڈریس انہوں نے پڑھا اسے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھی عام جلسوں میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ کانپور میں ان کا اردو ایڈریس پڑھنے کی عزت مجھے دی گئی تھی۔ تحریکِ عدم تعاون کے سلسلے میں گاندھی جی سے ان کے شدید اختلافات ہو گئے جو آخر

وقت تک نہ مٹ سکے۔ انہوں نے اس تحریک کی یہ کہہ کر مخالفت کی تھی کہ وہ بالآخر تشدد پر منتج ہوگی اور جب عوام حقیقتاً تشدد پر اُتر آئے تو انہوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ ''وہ پتھر کا جواب گولی سے دے اور عدم تعاون کرنے والوں کو ڈاک اور تار وغیرہ کی سہولتوں سے یکسر محروم کردے۔'' اس مشورہ کی وجہ سے ان کی ہر دلعزیزی میں بڑا فرق آ گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کروں گا جو میرا آنکھوں دیکھا ہے۔ امپائر تھیٹر بمبئی میں ایک جلسے میں جو گاندھی جی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، مسز بیسنٹ بھی بولنے والی تھیں۔ جب وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑی ہوئیں تو کچھ نوجوانوں نے ہڑبونگ مچائی اور انہیں تقریر کرنے سے روک دیا۔ یہ دیکھ کر گاندھی جی اُٹھے اور انہوں نے پہلے تو مسز موصوفہ کی قومی و ملّی خدمات کو سراہا اور گڑبڑ کرنے والوں کو خوب ڈانٹا اور آخر میں ان سے مطالبہ کیا کہ وہ کھڑے ہو کر مسز موصوفہ سے معافی مانگیں ''جن کے بال ہندوستان کی خدمت میں سفید ہو گئے ہیں۔'' چنانچہ گڑبڑ مچانے والے کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ اس کے بعد ان کی تقریر ہوتی رہی۔ یہ اس ہیجان انگیز دور کا واقعہ ہے جب کہ فضائے ہند پر گاندھی جی چھائے ہوئے تھے اور دوسرے لیڈروں کی لیڈری ماند پڑ چکی تھی۔

لکھنؤ پیکٹ کی تکمیل میں بھی انہوں نے نمایاں حصّہ لیا تھا۔ اسی زمانے میں لکھنؤ کے ایک جلسے میں انہوں نے دورانِ تقریر میں فرمایا کہ ''اکیلا اسلام ہی وہ مذہب ہے جو مایوسی نہیں سکھاتا۔'' اس پر زوروشور سے تالیاں بجائی گئیں اور وہ مسلمانوں میں بے حد ہردلعزیز ہو گئیں۔

''کامریڈ'' کے بند ہو جانے پر اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر راجہ غلام حسین نے لکھنؤ سے ''نیو ایرا'' نکالنا شروع کیا۔ جب کچھ عرصہ بعد ایک دردناک حادثے کے نتیجے میں ان کی موت واقع ہو گئی تو مسز بیسنٹ نے ان کے بال بچوں کی امداد کے لیے ایک فنڈ کھولا اور جتنی رقم اس میں جمع ہو گئی تھی اسے مرحوم کی بیوی کے نام بھیج دیا۔ راجہ غلام حسین بھی ''ہوم رول لیگر'' تھے۔

اپنی نظربندی؁ سے رہائی پانے کے بعد مسز بیسنٹ سیدھی شملہ گئیں تاکہ علی برادران کی رہائی کی کوشش کریں۔ وہ شملہ سے ناکام لوٹ رہی تھیں کہ کانپور کے اسٹیشن پر تھیوسوفیکل اسکول کے چند اراکین نے ان کی پذیرائی کی۔ چونکہ پذیرائی کرنے والوں میں اکیلا میں ہی مسلمان تھا، اس لیے انہوں نے مجھے علیحدگی میں اس گفتگو کا خلاصہ بتایا جو وہ چیمسفورڈ سے علی

برادران کی رہائی کے متعلق کر چکی تھیں اور پھر فرمایا: ''ان کی رہائی کی راہ میں وہ سب سے بڑی دشواری حائل ہے وہ مولانا محمد علی کا مفروضہ فارسی خط ہے جس میں انہوں نے امیرِ افغانستان کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ یہ خط دیکھ کر میں ٹپٹا گئی اور علی برادران کی رہائی کے لیے زیادہ لب کشائی نہ کر سکی۔ تم یہ سارا معاملہ پریس میں دے دو، تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ صورتِ حال کیا ہے۔ بہر حال میں غافل نہیں ہوں اور میں ان کی رہائی کے لیے برابر جدوجہد کرتی رہوں گی۔'' چنانچہ مسز موصوفہ کے ارشاد کے مطابق میں نے اردو اور انگریزی اخبارات میں ایک بیان شائع کر دیا۔ بیان کا شائع ہونا تھا کہ ملک بھر میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور یہ بحث چھڑ گئی کہ آیا مولانا محمد علی نے امیرِ افغانستان کے نام کبھی کوئی خط بھیجا بھی تھا یا نہیں، ساتھ ہی یہ بحث بھی چھڑ گئی کہ آیا مسز بیسنٹ کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ علی برادران کی رہائی کی کوششیں کریں۔ بعض اخبارات نے جن میں لکھنؤ کا ''نیوایرا'' بھی پیش پیش تھا، یہ لکھا کہ ''ہمیں مسز بیسنٹ کی خدمات کی ضرورت نہیں، ہم مسلمان اپنی لڑائیاں خود لڑ لیں گے۔'' یہ نوٹ بمبوق نے لکھا تھا اور اس کا جواب میں نے ''لیڈر'' (الٰہ آباد) کے ذریعے دیا جس میں لکھا گیا تھا کہ ''کسی شخص کو مسز بیسنٹ کی نیت پر حملہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، بلکہ الٹا ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے از خود علی برادران کی رہائی کے لیے کوششیں کی۔'' اس کے بعد سے ''نیوایرا'' نے مخالفت ترک کر دی۔ بعد کو ۱۹۱۸ء کی ابتدا میں جب میں چھندواڑہ گیا تو مولانا محمد علی سے اس فارسی خط کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ مولانا نے فرمایا: ''میں نے ساری زندگی میں کبھی کسی کو فارسی میں خط نہیں لکھا اور اگر یہ خط میرا ہے تو حکومت مجھ پر کھلی عدالت میں مقدمہ کیوں دائر نہیں کرتی؟'' یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ (مفروضہ) خط کے باوجود علی برادران دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخری ہفتے میں رہا کر دیے گئے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ خط سی آئی ڈی کا اختراعی کارنامہ تھا۔

یہ ملاقات صرف چند منٹ رہی مگر آج تک میرے کان اس ''نقرئی زبان والی خاتون'' کی آواز سے لذت گیر ہیں۔ میں اپنے تئیں خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے ان سے دو تین مرتبہ ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا، ویسے مجھے ان کی متعدد تقریریں سننے کی سعادت بھی حاصل رہ چکی ہے۔

تقریباً ۸۷ برس تک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد جو تمام تر خدمتِ انسانی میں بسر ہوئی، مسز بیسنٹ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۳ء کو طویل علالت کے بعد عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت فرما گئیں اور مدراس کے مقامِ ادیار میں جسے انہوں نے بنارس کے بعد اپنی تحریکات کا مرکز بنا لیا تھا، ان کی نعش ہندو دھرم کے مطابق سپردِ آتش کر دی گئیں۔

جب وہ اپنے ربّ سے ملی ہوں گی تو وہ اس خیال سے یقیناً مسرور ہوں گی کہ ان کی ساری ارضی زندگی ذات پات کی قیود سے بالاتر ہو کر خالصۃً بنی نوعِ انسان کی خدمت میں صرف ہوئی۔ ان کی زندگی درحقیقت ''**افضل الاشغال خدمت الناس**'' کی تفسیر تھی۔

۔۔۔۔۔۔

حوالہ و حواشی:

۱۔ مسز بیسنٹ جون ۱۹۱۷ء میں گورنر مدراس لارڈ پینٹ لینڈ کے حکم سے نظر بند کی گی تھیں اور چار مہینے کے بعد رہا کر دی گئی تھیں۔